اسلام میں اختلاف کے آداب

(۶)

عہدِ تابعین میں اختلاف اور اس کے آداب

ترجمہ و تلخیص جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ طریقہ کار اپنایا ہوا تھا کہ وہ صحابہ کرامؓ کو مدینے سے باہر سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ صحابہ کرام جہاد، تعلیم و تدریس، امارت اور قضا وغیرہ جیسی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سفر تو کرتے مگر مدینہ منورہ جیسے دارالخلافہ کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا مستقل مقام و مستقر ہوتا۔ صحابہ کرام چونکہ دعوتِ اسلامی کے علمبردار اور اس کے ہراول دستہ تھے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ خلیفہ کے قریب رہ کر خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ان کی معاونت کریں، اور اُمت کے معاملات و مسائل کو حل کرنے میں ان کے شریک کار رہیں۔

حضرت عثمانؓ نے جب بارِ خلافت اُٹھایا تو انہوں نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ چھوڑ کر دوسرے اسلامی شہروں میں اقامت اختیار کرنے کی اجازت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ جس کے بعد قراء اور فقہائے کرام مفتوحہ علاقوں، اور آباد کردہ شہروں میں منتقل ہونے لگے۔ چنانچہ صرف کوفہ و بصرہ میں تین سو سے زیادہ صحابہ کرام سکونت پذیر ہو گئے، اسی طرح مصر و شام میں بھی کئی صحابہؓ مقیم تھے۔

ایک روایت کے مطابق، غزوہ حنین سے واپسی کے بعد صرف مدینہ منورہ میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ ہزار صحابہ موجود تھے جن میں سے آپ کے انتقال کے وقت دس ہزار باقی رہ گئے اور دو ہزار دوسرے شہروں کو نقل مکانی کر چکے تھے۔[1]

فقہاء اور قراء صحابہ کرامؓ سے تابعین نے علم حاصل کر کے آگے منتقل کیا، جیسے مدینہ میں سعید بن المسیب (جنہیں حضرت عمرؓ کے فقہ کے حامل اور ان کا راوی کہا جاتا ہے)، مکہ میں عطاء بن ابی رباح، یمن میں طاؤس، یمامہ میں یحییٰ بن ابی کثیر، بصرہ میں حسن بصری، شام میں مکحول، خراسان میں عطاء، کوفہ میں علقمہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام حضرات اکثر مواقع پر انہی صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں فتویٰ اور اجتہاد کا کام انجام دیتے تھے جن سے انہوں نے علم و فقہ حاصل کیا تھا، اور استنباطِ احکام میں جن کے طریقوں سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ تابعین کرام بھی آپس کے اختلافات میں صحابہ کے آداب پر کاربند رہے، اور ان کے مقرر کردہ حدود و اطوار سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا۔ یہی وہ فقہاء ہیں جن سے بعد میں آنے والی نسلیں متاثر ہوئیں۔ اور انہی سے فقہ کی دولت پائی۔ دیت کے بارے میں مندرجہ ذیل دو مباحثوں سے تابعین کے آدابِ اختلاف اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

امام حدیث عبدالرزاق نے شعبی کے ذریعے سے روایت بیان کی ہے کہ جس میں وہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس ایک شخص آیا اور ان سے انگلیوں کی دیت (خون بہا) کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہر انگلی پہ دس اونٹ۔ اس نے کہا سبحان اللہ! کیا انگوٹھا اور درمیان کی بڑی انگلی دونوں برابر ہیں؟ قاضی شریح نے فرمایا: افسوس تم پر! سنت نے ایسا قیاس کرنے سے منع کیا ہے۔ اس کی پیروی کرو اور نئی بات نہ نکالو۔[2]

موطا امام مالک میں مروی ہے کہ ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے عورت کی انگلی کے خون بہا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: دس اونٹ۔ میں نے پوچھا

---

[1] الفکر السامی ۱/۳۱۱۔

[2] مصنف عبدالرزاق: الفکر السامی ۱/۳۹۱۔ ابن منذر نے بھی صحیح سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

دو انگلیوں کا؟ انہوں نے فرمایا: بیس اونٹ۔ میں نے پوچھا: تین انگلیوں کا؟ فرمایا: تیس اونٹ۔ میں نے پھر پوچھا: چار پر؟ انہوں نے کہا: بیس اونٹ۔ میں نے کہا: جب زخم بڑھ گیا اور تکلیف میں اضافہ ہوگیا تو خون بہا کم ہوگیا۔ اس پر حضرت سعید بن المسیب نے پوچھا: کیا تم عراقی ہو×؟ میں نے کہا: نہیں، میں تو اپنے علم کی توثیق کرانا چاہتا ہوں یا اپنے علم میں اضافہ کا خواہشمند ہوں۔ انہوں نے فرمایا: برادرزادے سنت یہی ہے[1]

زیادہ سے زیادہ اختلاف اسی درجے کا ہوتا تھا نہ تو کوئی اپنی رائے کی درستگی کا دعویٰ کرتا اور نہ ہی دوسرے کو جہالت کا الزام دیتا تھا، نہ اُسے یہ زعم ہوتا کہ میں ہی حق پر ہوں اور دوسرا باطل پر ہے۔

حضرت سعید بن المسیب اور اہلِ حجاز کا مسلک یہ ہے کہ تیسرے حصے تک مرد اور عورت کے خون بہا میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے زیادہ کی صورت میں عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں آدھی ہوگی۔ اس کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب کی وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے بیان کی ہے کہ عورت کی دیت تیسرے حصے تک مرد کے برابر ہے[2] جب کہ عراقی فقہا کی رائے یہ ہے کہ شروع ہی سے عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں آدھی ہے[3]

امام اوزاعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی ایک دفعہ مکہ میں ملاقات ہوئی تو امام اوزاعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا: آپ لوگ رکوع میں جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: اِس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی

[1] مؤطا (مع شرح زرقانی) ۴/۱۸۸ - مصنف عبدالرزاق ۹/۳۴۹ - سنن بیہقی ۸/۹۶

[2] سنن نسائی ۸/۵۴، دارقطنی ۴/۳۶۴

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المغنی (ابن قدامہ) ۸/۳۱۴ - ۳۱۵ (ط: دارالفکر ۱۹۸۴ء)۔

× اِس جملے کی وضاحت آگے آئے گی۔

صحیح روایت مروی نہیں۔ امام اوزاعیؒ نے کہا: یہ کیسے؟ خود مجھ سے امام زہریؒ نے یہ حدیث بیان کی، ان سے سالم نے، ان سے ان کے باپ (عبداللہ بن عمرؓ) نے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نماز کی ابتداء اور رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: مجھ سے حماد نے، ان سے ابراہیم نخعیؒ نے، ان سے علقمہ اور اسود نے اور ان سے ابن مسعودؓ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز کی ابتداء میں رفع یدین فرماتے اور اس کے بعد کسی موقع پر بھی ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔

امام اوزاعیؒ نے کہا: میں آپ کو زہری سے سالم کی اور ان سے ان کے باپ (ابن عمرؓ) کی روایت سنا رہا ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے حماد نے اور ان سے ابراہیمؒ نے روایت بیان کی ہے....؟

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: حماد زہری سے اور ابراہیم نخعی سالم سے زیادہ فقیہہ ہیں، اور علقمہ بھی ابن عمرؓ سے کم نہیں، اگر ابن عمر کو شرفِ صحابیت حاصل ہے تو اسود کے بھی بڑے فضائل ہیں، جب کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی جلالتِ قدر تو سب کو معلوم ہے۔ اس پر امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔[1]

امام ابوحنیفہؒ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہم نے جو آراء ظاہر کی ہیں، اُن کے قبول کرنے کے سلسلے میں کسی پر جبر نہیں کرتے، اور نہ کسی سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہماری رائے کو تسلیم کر لے، اگر کسی کے پاس اس سے اچھی بات ہو تو وہ اُسے پیش کرے"[2]۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ تمام حضرات سنت کے پیروکار تھے۔ سنت جب صحیح سند کے

---

[1] المفکر السامی ۱/۳۲۰۔

[2] انتقاد ص ۱۴۰۔

ساتھ ان تک پہنچتی تو وہ قطعی طور پر اس سے اختلاف نہ کرتے، البتہ حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں اختلاف واقع ہوتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے اخذ کردہ مفہوم کو اس وقت تک صحیح مانتا جب تک لفظ کے اندر اس کا احتمال موجود ہوتا، اور اس مفہوم کے خلاف دوسرے فریق کے پاس مستند دلائل بھی موجود نہ ہوتے۔

اعتقادی اور فقہی اختلافات پر سیاسی اختلاف کے اثرات جن اختلافات کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے ان کا تعلق عوام کی اکثریت سے تھا۔ ان کا بیشتر حصہ فقہی اختلافات پر مشتمل تھا جن میں حتمی فیصلے کے لیے قرآن و سنت ہی کو مرجع بنایا جاتا۔ بعض اوقات اس طرح کے اختلافات کی بنیاد صرف اتنی ہوتی کہ ایک شخص تک کوئی حدیث پہنچتی جب کہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہوتا۔ یا اس کی بنیاد نص یا اس کے الفاظ کے سمجھنے میں اختلاف ہوتا۔

ان فقہی اختلافات پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی وہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور دارالخلافہ کے کوفہ سے شام منتقلی کے بعد ظہور پذیر ہونے والے سیاسی اختلافات تھے۔ اس نئی صورتِ حال نے اُمتِ مسلمہ کے اندر اختلافات کی خلیج کو بہت وسیع کر دیا اور دائرۂ اختلاف میں ایسے نئے اُمور شامل ہو گئے، جو اس سے پہلے اس کا حصہ نہ تھے۔ اس کے نتیجے میں ہر علاقے کے افراد کا ان تک پہنچنے والی روایات پر انحصار کرنے کا رجحان شدید تر ہو گیا۔ دیگر علاقوں میں پھیلی ہوئی روایت کے سلسلہ میں ان کا رویہ شک و شبہ اور عدم اعتماد کا ہوتا، جس کے پیچھے درحقیقت سیاسی وابستگیاں اور گروہی کشمکش کارفرما تھی۔ چنانچہ عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ میں متنوع سیاسی افکار نے جنم لیا اور کئی جہتیں اختیار کیں اور اپنے تمام تر تنوع اور پیچیدگیوں کے ساتھ یہ افکار دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں شیعہ، جہمی، معتزلہ، خوارج، اور دیگر کئی راہِ حق سے منحرف گروہ اور فرقے پروان چڑھے۔ جھوٹی حدیثیں اور سیاسی رنگ کے واقعات گھڑنے کے رجحان کو بھی یہیں فروغ حاصل ہوا۔ یہ صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی کہ حضرت امام مالک پکار اُٹھے کہ کوفہ جھوٹ کی ٹکسال گاہ ہے[1]۔ اور امام زہری نے کہا: ہمارے

---

[1] الفکر السامی ۱/۳۱۳

ہاں جو حدیث بالشت بھر ہوتی ہے وہ عراق پہنچ کر ایک گز طویل ہو جاتی ہے۔[1]

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خود اہلِ عراق قبولِ حدیث کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ضمن میں انہوں نے قبولِ حدیث کے لیے ایسی کڑی شرطیں عائد کیں جن کا اس دور سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ان کی یہ خواہش کارفرما تھی کہ ان کا فقہی ورثہ حق سے منحرف فرقوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔ اہلِ حجاز کا رویہ عراقیوں سے کہیں بڑھ کر احتیاط پسندی پر مبنی تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اہلِ حجاز عراقیوں یا شامیوں کی کوئی روایت اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ خود حجاز کے اندر اس کی بنیاد نہ مل جاتی۔[2]

ایک حجازی عالم سے پوچھا گیا کہ ایک حدیث جسے سفیان ثوری نے منصور معتمر سے، انہوں نے ابراہیم نخعی سے، انہوں نے علقمہ نخعی سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ..... سے روایت کیا ہو اس سلسلہ روایت کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے، جبکہ عراقیوں کے نزدیک اسے سب سے زیادہ مضبوط اور قابلِ اعتماد سند سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: اگر اس کی کوئی بنیاد حجاز میں ہو تب تو وہ قابلِ قبول ہوگی بصورتِ دیگر نہیں۔[3]

ایک عباسی خلیفہ نے امام مالکؒ کے ممتاز استاذ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کو جن کا تعلق مدینہ سے تھا، اپنا وزیر اور مشیر مقرر کیا، وہ جلد ہی اپنے اس منصب سے علیحدہ ہو گئے اور مدینہ لوٹ آئے۔ ان سے پوچھا گیا: آپ نے اہلِ عراق کو کیسے پایا؟ تو انہوں نے جواب دیا: وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نزدیک ہمارا حلال حرام ہے۔ اور ہمارا حرام حلال ہے۔ وہاں چالیس ہزار ایسے افراد ہیں جو دین کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو نبی ہمارے ی طرف

[1] الانتقاء

[2] الفکر السامی

[3] ایضاً

ساتھ ان تک پہنچتی تو وہ قطعی طور پر اس سے اختلاف نہ کرتے، البتہ حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں اختلاف واقع ہوتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے اخذ کردہ مفہوم کو اس وقت تک صحیح مانتا جب تک لفظ کے اندر اس کا احتمال موجود ہوتا، اور اس مفہوم کے خلاف دوسرے فریق کے پاس مستند دلائل بھی موجود نہ ہوتے۔

اعتقادی اور فقہی اختلافات پر سیاسی اختلاف کے اثرات جن اختلافات کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے ان کا تعلق عوام کی اکثریت سے تھا۔ ان کا بیشتر حصہ فقہی اختلافات پر مشتمل تھا جن میں حتمی فیصلے کے لیے قرآن و سنت ہی کو مرجع بنایا جاتا۔ بعض اوقات اس طرح کے اختلافات کی بنیاد صرف اتنی ہوتی کہ ایک شخص تک کوئی حدیث پہنچتی جب کہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہوتا۔ یا اس کی بنیاد نص یا اس کے الفاظ کے سمجھنے میں اختلاف ہوتا۔

ان فقہی اختلافات پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی وہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور دارالخلافہ کے کوفہ سے شام منتقلی کے بعد ظہور پذیر ہونے والے سیاسی اختلافات تھے۔ اس نئی صورتِ حال نے اُمتِ مسلمہ کے اندر اختلافات کی خلیج کو بہت وسیع کر دیا اور دائرۂ اختلاف میں ایسے نئے اُمور شامل ہو گئے، جو اس سے پہلے اس کا حصہ نہ تھے۔ اس کے نتیجے میں ہر علاقے کے افراد کا ان تک پہنچنے والی روایات پر انحصار کرنے کا رجحان شدید تر ہو گیا۔ دیگر علاقوں میں پھیلی ہوئی روایت کے سلسلہ میں ان کا رویہ شک و شبہ اور عدم اعتماد کا ہوتا، جس کے پیچھے درحقیقت سیاسی وابستگیاں اور گروہی کشمکش کارفرما تھی۔ چنانچہ عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ میں متنوع سیاسی افکار نے جنم لیا اور کئی جھتیں اختیار کیں اور اپنے تمام تر تنوع اور پیچیدگیوں کے ساتھ یہ افکار دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں شیعہ، جہمی، معتزلہ، خوارج، اور دیگر کئی راہِ حق سے منحرف گروہ اور فرقے پروان چڑھے۔ جھوٹی حدیثیں اور سیاسی رنگ کے واقعات گھڑنے کے رجحان کو بھی یہیں فروغ حاصل ہوا۔ یہ صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی کہ حضرت امام مالک پکار اُٹھے کہ کوفہ جھوٹ کی ٹکسال گاہ ہے۔[1] اسی امام زہری نے کہا: ہمارے

[1] الفکر السامی ۱/۳۱۳

رک جائے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

پھر ان سے پوچھا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک کونسا گناہ بڑا ہے؟ کسی بے گناہ کو قتل کرنا یا زنا؟ ابوحنیفہؒ نے جواب دیا: کسی کو قتل کرنا۔ آپ نے فرمایا نہیں، اس لیے کہ قتل کے سلسلے میں تو دو گواہوں کی گواہی قابلِ قبول قرار دی ہے جب کہ زنا کے لیے چار گواہ ضروری قرار دیئے ہیں پھر بھلا تمہاری رائے اور قیاس کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے پوچھا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے اور نماز میں کس کی اہمیت زیادہ ہے؟

امام ابوحنیفہؒ نے کہا: نماز کی۔

آپ نے فرمایا: ایسی صورت میں حائضہ عورت روزوں کی تو قضا کرتی ہے جب کہ نماز کی قضا اس پر فرض نہیں۔ آخر کیوں؟ اے اللہ کے بندے اللہ سے ڈرو اور رائے و قیاس سے کام مت لیا کرو، ورنہ کل ہم اور آپ اللہ کے حضور جب کھڑے ہوں گے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول نے یہ کہا جب کہ آپ اور آپ کے ساتھی کہیں کہ ہم نے ایسا سمجھا اور یہ ہماری رائے تھی، پھر خود ہی سوچ لو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اور آپ سے کیا سلوک کرے گا۔[1]

امام جعفر صادقؒ کے یہ سوالات ایسے نہ تھے جو امام ابوحنیفہؒ جیسے شخص کوئی جواب کر دیتے۔ امام صاحب نے صرف اہلِ بیتِ رسولؐ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر سوال کے جواب میں خاموشی کو ترجیح دی۔

---

[1] اعلام الموقعین ۱/۲۵۵—۲۵۶